رباعیاتِ غمگین میں تصوف کی رو

مجاہد حسین

ABSTRACT:

Ruba'ee is a genera of poetic expression that provides the best means of expression to mysticism.This genera, too,like other genera of expression found its place to urdu under the influence of persian.Many poets opted for this medium to describe mysticism.Ruba,ee and mysticism go side by side.In this article mysticism described, found in Ruba,eyaat e Ghamgeen Dehalvi.Mr Mujahid Hussain endeavoured successfully to extract the element of mysticism in Ghamgeen Dehalvi,s ruba,eeyaat.The writer first discussed mysticism and then mysticism in kalaam e Ghamgeen is brought to light.

اُردو کی دوسری اصنافِ سخن قصیدہ، غزل اور مثنوی کی طرح رباعی بھی فارسی سے اُردو میں آئی ہے، بہت عرصے تک فارسی کے زیرِ اثر اردو رباعی کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ پھر بھی اردو نظم کے تاریخی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو شاعری کے بالکل ابتدائی دور میں بھی رباعیات کہی جاتی تھیں۔ چنانچہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں متعدد رباعیاں موجود ہیں۔ چونکہ محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کسی شاعر کی رباعیاں دستیاب نہیں ہوئیں اس لیے اسی کو اردو رباعی کا پہلا شاعر سمجھنا چاہیے۔

رباعی عربی کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی چار کے ہیں۔ چار شاعرانہ مصطلحات میں رباعی اس صنفِ سخن کا نام ہے جس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں ایک خیال ادا کیا جاتا ہے۔ گویا رباعی اُردو کی وہ مختصر ترین صنف سخن ہے جس میں مقررہ اوزان، وحدتِ خیال اور تسلسل بیان کی پابندی از بس ضروری ہے۔

غزل کی طرح رباعی بھی مردّف اور غیر مردّف ہوسکتی ہے خواہ صرف قافیہ لائیں یا قافیہ ردیف دونوں چونکہ عربی شاعری میں ردیف کا رواج نہ تھا اس لئے قدیم فارسی دان عربی شعرا نے اکثر غیر مردف رباعیاں کہی ہیں۔

رباعی میں وزن کی تخصیص کے ساتھ ساتھ قوافی کی ترتیب کا بھی مخصوص نظام ہے۔ اُردو فارسی کے تمام علمائے فن اس امر پر متفق ہیں کہ رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر تیسرے مصرعے میں قافیہ لایا جائے تو عیب نہیں بلکہ قدما کے نزدیک مستحسن ہے۔ فارسی کے قدیم ترین تذکرے ''لباب الالباب'' کے مؤلف محمد عوفی نے شعرا کا جو انتخاب دیا ہے اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عنصریؔ وفرخیؔ کے عہد تک بیشتر شعرا چاروں مصرعوں میں قافیہ لاتے ہیں۔

رباعی میں تسلسل بیان اور خیال کے تدریجی ارتقا کے خوبصورت اظہار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعے زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہوں۔ الفاظ وتراکیب کا انتخاب، موضوع کی مطابقت سے ایسا برمحل ہو کہ اس سے بہتر کا تصور ہی نہ ہو سکے۔ پہلے مصرعہ میں مناسب الفاظ کے ساتھ خیال کو روشناس کرایا جائے۔ دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کے خط و خال کچھ اور نمایاں کیے جائیں اور چوتھے مصرعے میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدت کے ساتھ سامنے لایا جائے کہ سننے والا مسحور و متحیر ہوکر رہ جائے، یوں سمجھ لیجئے کہ رباعی کے پہلے تین مصرعے، رباعی کے مجموعی شاعرانہ حسن و اثر کے لیے ایک ایسی لطیف اور سادہ فضا تیار کرتے ہیں جس سے سامع اکثر بےخبر رہتا ہے۔ لیکن یہی سادہ پرکار فضا جب چوتھے مصرعہ میں ڈرامائی انداز سے سامنے آتی ہے تو بڑی جرأت آزما بن جاتی ہے۔

مولانا ابوسعید ابوالخیرؒ، نظامی گنجوی اور فریدالدین عطار نے متصوفانہ افکار سے اور عمر خیام وسرمد نے سرمستی، رندی حکمت اور عشق کے خیالات سے فارسی رباعی کو مالا مال کردیا ان بزرگوں کی بدولت رباعی کا دامن دوسری اصناف کی طرح وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ تو کسی نہ کسی حد تک اپنے لئے مخصوص موضوع رکھتے ہیں لیکن رباعی اس قید و بند سے آزاد ہے۔ اُردو فارسی کی ادبی تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ برجستہ گوئی کا کام زیادہ تر رباعی سے لیا گیا ہے۔ زندگی کے روزمرہ مسائل سے لے کر اہم امور تک اس میں نظم کیے گئے ہیں۔ اُردو میں حالیؔ، اکبرؔ، انیسؔ، جوشؔ، امجدؔ، فراقؔ، اقبال، عارف عبدالمتین اور پروفیسر شور کی رباعیاں صاف پتہ دیتی ہیں کہ رباعی نے ہمیشہ وقت کے عام تقاضوں کا ساتھ دیا ہے اور جدید سے جدید رجحانات کو اپنایا ہے۔ معنوی حیثیت سے رباعی میں غزل کی سی لچک اور وسعت ہے، جس طرح مختلف دور کی غزلیں مختلف رجحانات کی نمائندگی کرتی ہیں، بالکل اسی طرح رباعیات بھی اپنے عہد کی آئینہ دار نظر آتی ہیں۔ اس لئے رباعی کے موضوعات کی حد بندی نہیں کی جاسکتی، خاص طور پر آج اُردو فارسی رباعی میں زندگی کے جن گوناگوں مسائل کا ذکر ملتا ہے، ان کی روشنی میں قدیم تذکرہ نگاروں کی یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی کہ رباعی میں صرف اخلاقی اور اصلاحی یا فلسفیانہ مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے لے کر آج تک رباعی میں مرثیہ کا اثر نمایاں ہے بلکہ انیس و دبیر کے عہد تک کی اردو رباعیاں بالعموم مرثیہ ہی کے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان رثائیہ رباعیوں میں شاعرانہ حسن زیادہ نہیں ہے لیکن اردو شاعری میں مقصدیت کی تاریخ جس وقت مرتب کی جائے گی تو رباعی کا نام سب سے

پہلے آئے گا۔ مرثیہ نے یقیناً اردو شاعری میں اخلاقی اور اصلاحی رجحانات کو فروغ دینے میں مدد دی ہے۔لیکن ان رجحانات کی اولین نمائندہ رباعی ہے۔ مرثیہ کے موضوعات نے زیادہ تر صرف لکھنوی دبستانِ شعر کو شائستہ اور پاکیزہ بنانے میں مدد دی ہے لیکن رباعی شروع ہی سے اردو شاعری کے عام لب و لہجہ کو سنوارنے کی فکر میں رہی ہے۔ اخلاقی و اصلاحی رجحانات کی ترویج کے سلسلے میں رباعی مرثیہ کی مقلد نہیں بلکہ پیش رو کی حیثیت سے سامنے آئی ہے۔

قطعہ اور رباعی کے فرق کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ رباعی کے اوزان مخصوص ہیں۔ ان مخصوص اوزان کے سوا کسی دوسرے بحر و وزن کے دو شعروں کو قطعہ سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ قطعہ کے باب میں اہلِ عروض و قواعد نے یہ حکم لگایا ہے کہ اس کے پہلے مصرعے میں قافیہ نہیں آتا لیکن عملاً یہ پابندی ضروری نہیں خیال کی گئی اس لیے کہ بعض علما و شعرا نے دو مقفّی شعروں کو بھی قطعہ کا نام دیا ہے۔ اردو فارسی کے دواوین میں اس کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں بلکہ بعض جگہ ان کی صراحت بھی کر دی گئی ہے۔ مدون یا ناشر سے اکثر یہ غلطی ہوتی ہے کہ وہ قطعات کو رباعی کے ذیل میں درج کر جاتے ہیں چنانچہ کلیاتِ ظفر، کلیاتِ ناسخ اور دیوانِ ذوق مطبع نول کشور میں ایسی غلطیاں موجود ہیں۔لیکن جو لوگ رباعی کے وزن کی فنی خصوصیات کو سمجھتے ہیں وہ قطعہ کو رباعی کے تحت کبھی نہیں لاتے مثلاً دیوانِ ذوق میں اس قطعہ کو رباعی کے تحت درج کیا گیا ہے:

دنیا سے ذوق رشتۂ الفت کو توڑ دے
جس سر کا ہے یہ بال اسی سر میں جوڑ دے
پر ذوق تو چھوڑ دے اس پیرزال کو
یہ پیرزال اگر تجھے چاہے تو چھوڑ دے (۱)

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد چہار بیتی کو دو بیت یا دو بیتی بھی کہا جانے لگا۔ سلجوقیوں کے عہد میں وہ صرف ترانہ یا دو بیتی کہلاتی تھی اور غالباً عمر خیام کے زمانے تک اسے دو بیتی ہی کہا جاتا تھا۔ اس وقت تک بالعموم چاروں مصرعوں میں قافیہ لاتے تھے۔ جب چھٹی صدی ہجری میں رباعی کا نام مخصوص ہو گیا تو تیسرے مصرعے سے قافیہ غائب ہو گیا لیکن تیسرے مصرعے میں قافیہ لانا کوئی جرم نہ تھا کچھ دنوں بعد ہر وزن و بحر کے ایسے دو بیت کو دو بیتی کہنے لگے جس کے پہلے دو مصرعے مقفّی ہوں یا چاروں مصرعے باہم قافیہ رکھتے ہوں اور رباعی کا نام مخصوص وزن کے لیے رواج پا گیا اور آج تک دو بیتی و رباعی میں یہی فرق کیا جاتا ہے کہ رباعی مخصوص وزن و بحر میں ہوتی ہے اور دو بیتی بھی وزن و بحر میں ہو سکتی ہے۔

رباعی ایرانی ترانہ یا چہار بیتی کا عربی نام ہے۔ فارسی اردو یا عربی شعری مصطلحات میں اب بالعموم یہی نام لکھا جاتا ہے۔ جدید فارسی میں چونکہ دوسری زبانوں کے الفاظ پر ایرانی الاصل الفاظ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لیے جدید فارسی ادب میں ترانہ کا لفظ زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اہلِ عرب یا عربی داں عجمیوں نے ترانہ یا چہار بیتی کو رباعی کا نام کیوں دیا؟ علمائے فن نے اس کی مختلف توجیہیں کی ہیں۔ صاحبِ بحر الفصاحت لکھتے ہیں۔

''در بدائع الافکار فی صنائع الاشعار میں'' ملا حسین کاشفی واعظ نے لکھا ہے کہ رباعی اس کو اس

لیے کہتے ہیں کہ یہ بحر ہزج سے مخصوص ہے اور بجز عربی کے شعروں میں چار اجزء پر ختم ہوتی ہے،، (۲)

اس حوالہ سے محمد بن قیس رازی کا بیان ملاحظہ ہو:

''ومستعر بہ آں را رباعی خوانند از بہر آنکہ بحر ہزج در اشعار مربع الاجزاء آمدہ است پس ہر بیت ازیں بیت عربی باشد۔'' (۳)

بعض محققین نے نصیر الدین طوسی کے اس بیان سے اکتفا کیا ہے کہ:

''ترانہ را قدما چہار بیت گرفتہ اند و آنرا چہار بیتی خواندہ و بتازی رباعی۔'' (۴)

یہ رائے ظاہر ہے کہ اہل عرب نے قدیم چہار بیتی کی تقلید میں اس صنف کا نام رباعی رکھا چنانچہ حافظ محمود شیرانی نے علامہ سید سلیمان ندوی سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں یہ توجیہہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ چونکہ ہزج عربی میں مربع الارکان آئی ہے اس بناء پر اس کو رباعی کہنے لگے ہیں۔عربی میں یہی ایک بحر تو نہیں ہے جو مربع آتی ہے اس میں اکثر بحریں مربع استعمال ہوتی ہیں۔ پھر ہزج کی کیا خصوصیت ہے۔اس کے علاوہ رباعی کی ابتدا فارسی سے ہوئی ہے نہ کہ عربی سے اس لیے اس کا نام رکھنے میں عربی خوانوں نے چہار بیتی کی تقلید کی۔'' (۵)

تخلیقی زندگی سے مراد محض ادب و شعر سے متعلق زندگی ہی نہیں بلکہ اس سے مراد وہ زندگی ہے۔جس میں عقل و حسن، انصاف و محبت کی اقدار موجود ہوں۔زندگی میں خیر و نیکی بہت ضروری ہے کیونکہ کائنات کا وصف خیر ہے اور خیر کے ادراک کے بغیر زندگی بدشکل اور بنجر بن جاتی ہے۔ مثبت اقدار کا فروغ ہی زندگی کی خوبصورتی کا ضامن ہے اور یہ اقدار تصوف میں تعلیم و تربیت کا حصہ ہیں۔ادب بھی مثبت اقدار کی ترجمانی کی بدولت اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ وسعت قلب و نظر کے بغیر تخلیق کا کام نہیں ہوسکتا۔ یہ وسعت قلب و نظر تصوف کی بے تعصبی اور رواداری میں بھی نظر آتی ہے۔تخلیق، جمالیاتی سطح پر قاری کو مسرور کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہنی افق کو بھی کشادہ کرتی ہے تاکہ معنی کو ایک وسیع تناظر میں رکھ کر سمجھا جا سکے۔

تصوف، اخلاقیات کا حامل ہوتا ہے اور اخلاق جمال ہی کا روپ ہوتا ہے۔ جمال، تخلیق کی بنیاد ہوتا ہے۔ مثبت اقدار، جمال کی ایک شکل ہیں اور ان کو فروغ دینا جمالیات کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔تصوف کائنات میں بکھری جمالی اشکال کو باطنی ربط و تنظیم کے ذریعے ایک مرکزی نظام میں پرو دیتا ہے۔ جبلت کو بااخلاق بنا دیتا ہے اور جذبے کی تہذیب کا کام کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''جن معاشروں نے جبلت کو مارنے کی بجائے اس کی تہذیب کرنے کی کوشش کی ہے وہاں ایک مضبوط اور دیرپا نظام اخلاق نے جنم لیا۔ادیب اگر اخلاقیات کا نمائندہ ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ادب کے لیے پند و نصائح تقسیم کرنے پر مامور ہے بلکہ اس لئے کہ وہ جذبے کی تہذیب

کا اہتمام کر کے خلق خدا کو جذبے کی بر بریت اور تشدد سے نجات دلاتا ہے۔'' (۶)

کائنات کی تمام چیزیں حقیقت اولیٰ کی شاہد ہیں، لہٰذا ان کو اصل حقیقت سمجھتے ہوئے حقیقت اولیٰ کی تلاش اور اس میں ضم ہو جانا ہی انسان کی معراج ہے۔صوفی حقیقت اولیٰ کو پانے کے بعد باطنی ربط کی وجہ سے نہ صرف انسانوں سے بلکہ کائنات کی دوسری اشیاء سے خود کو ہم کنار پاتا ہے، اس لئے اس کا تجزیہ زیادہ وسعت رکھتا ہے اور اس کا بیان جامعیت کا حامل ہوتا ہے اس کی مثال صوفیانہ مکاتیب اور ملفوظات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

اردو ادب اور تصوف باہم لازم و ملزوم ہیں۔ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ اردو کے اولین شعرا اور مصنفین خود صوفی تھے۔ جیسے اردو کے اولین شعرا میں شمالی ہند کے مشہور صوفی بزرگ شیخ فریدالدین گنج شکرؒ اور گجرات کے شیخ باجن بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ شیخ باجن کے علاوہ خوب محمد چشتی ،علی محمد جیو گام دھنی اور قاضی محمود دریائی گجری ادب کے ستون ہیں۔ یہ چاروں صوفی شاعر تھے۔تصوف اس عہد کا تخلیقی استعارہ تھا گجری ادب اسی استعارے سے پیدا ہوا۔ گجری زبان کو توانائی دے کر ان صوفیا نے قدیم اردو کی خدمت کی، اسے ادبی شکل دی۔ جکری کی صنف گجری ادب میں اسی زمانے میں مشہور ہوئی۔ اور قدیم صوفی شعرا نے جکریوں کے ذریعے صوفیانہ ادب تخلیق کیا۔ اس کے علاوہ خوب محمد چشتی نے اپنی کتاب **خوب ترنگ** میں مولانا روم کی طرز پر حکایات کی شکل میں تمثیلیں بیان کیں ہیں۔

بہمنی سلطنت دکن میں اردو ادب کی پہلی تخلیقی تجربہ گاہ سمجھی جاتی ہے۔ اس سلطنت کی تشکیل میں صوفیانہ روایات کا ایک مؤثر اور قابلِ ذکر حصہ ہے۔ اس دور میں خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے **چکی نامہ** کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے جس نے انسانی وجود کو چکی کا استعارہ بنا کر بامعنی بنا دیا۔ روحانی دانش کو فروغ دینے والے شاہ شمس العشاق کے'' دو ہے'' کو ادب سے کیسے خارج کیا جا سکتا ہے، بیجا پور کا ادب شاہ برہان الدین جانمؒ، شیخ غلام داول اور شاہ امین الدین اعلیٰ کے بغیر نامکمل ہے، اور یہ سب صوفیا تھے۔ اردو کی طرح فارسی ادب مولانا رومؒ، حفظ شیرازیؒ، عراقیؒ اور سعدیؒ کے بغیر کہاں ادب رہتا ہے۔ فارسی غزل اگر حافظ اور عراقی کے بغیر نامکمل ہے تو اردو غزل سے میر اور درد کو نکال کر کیا بچتا ہے اردو ادب کے یہ دونوں بڑے شاعر صوفی تھے۔ درد کے صوفی ہونے میں تو کسی کو شک نہیں مگر میر کے بارے میں دو آراء ہیں۔اردوادب کی تمام اصناف سخن خصوصاً غزل میں تصوف کے مسائل اس کثرت سے ادا کیے گئے ہیں کہ اگر صوفیانہ اشعار کو خارج کر دیا جائے تو اردو کا نصف سے زیادہ سرمایہ شعری باقی نہ رہے۔تصوف نے نئے الفاظ، اصطلاحات اور تلمیحات شاعری میں داخل کر کے شاعری کو وسعت بخشی۔تصوف کی آمیزش نے عاشقانہ شاعری کے مزاج کی اصلاح کر کے تصور محبت کو بلند کیا، اظہار محبت میں ادب و شائستگی اور وقار و متانت کے پہلو نکالے،صوفی شعرا نے قصیدہ گوئی کو خوشامد سے پاک کیا۔تصوف کی بدولت فلسفہ بھی شاعری میں داخل ہوا۔تصوف نے شاعری میں انسان کی عزت نفس کا خیال پیدا کیا اور انسان کو بتایا کہ وہ کون و مکان کو تسخیر کرسکتا ہے۔ اردو شاعری کی جسارت اور بے باکی صوفیا کی شطحیات کی بدولت ہے او یہ باغیانہ بے ادبی نہیں ہے بلکہ ناز عبودیت ہے۔

تصوف کی تعلیمات میں رازداری کی لہر سے اردو شاعری نے '' اخفائے راز'' کا گر اور رمزیت سیکھی ۔صفی حیدر دانش لکھتے ہیں :

'' تصوف وجد شاعرانہ کی ایک آئینی شکل ہے اور شعری ذوق صوفیانہ کی ایک والہانہ صورت کہی جا سکتی ہے ۔ ہر صوفی ذوق شعر سے اور ہر شاعر ،تصوف سے فطری لگاؤ رکھتا ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ تصوف و شاعری میں ان کے باہمی اشتراکیت وجدانیت کے سبب سے ایک ایسا بنیادی رابطہ اتحاد قائم ہے جو کسی حالت میں منقطع نہیں کیا جا سکتا ۔'' (۷)

اردو شاعری پر تصوف کے بے شمار عظیم احسانات ہیں۔ ان احسانات کے پیش نظر ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب سے تصوف کو خارج نہیں کیا جا سکتا ۔ اردو شاعری روز اول سے ہی آغوش تصوف میں پرورش پاتی رہی ۔ تصوف کی چاٹ اسے ورثے میں ملی ۔ فارسی شاعری کی واردات وحقائق اور اصطلاحات اردو شاعری میں رچ بس گئیں ۔بعض موقعوں پر قصائد کی تشبیہوں تک میں معرفت کے مضامین نفاست سے باندھے گئے ۔مختصر یہ کہ شاعری اپنے آہنگ و اطوار میں تصوف سے پورے طور پر متاثر رہی ہے ۔ اردو شاعری میں قلب کی اہمیت مسلم ہے ۔ اور یہ دل ،تصوف میں ادراک کا محل ہے ؛ انسان پر جس قدر مکاشفات ہوتے ہیں اور وارداتیں گزرتی ہیں ، اسی دل سے تعلق رکھتی ہیں ۔ صوفیاء کرام ہمیشہ شعر کہنے اور سننے کے شوقین رہے ہیں ۔صفی حیدر دانش نے دوسری صدی ہجری میں رابعہ شامیہ اور تیسری چوتھی صدی ہجری میں سری سقطی اور سمنون بن حمزہ سمیت متعدد صوفیا سے منسوب صوفیانہ اشعار کا ذکر کیا ہے ۔ (۸)

استعارات وتمثیلات شاعری کا زیور ہیں۔صوفیانہ واردات کے بیان میں بھی اہل تصوف کا کام ان کے بغیر نہیں چل سکتا کیونکہ ان کے باطنی جذبات و تجربات کی ترجمانی ایسے ہی اسالیب سے ہوسکتی ہے جو قارئین و سامعین کے خوابیدہ احساس کو بیدار کر سکیں اور شاعرانہ طرز بیان کا مقصد بھی قارئین کے ذہن میں ایک ایسا مفہوم لانا ہے جو عام سطح سے بلند تر ہو ۔صوفیانہ ادب میں رمزیت پسندی کی وجہ یہی ہے ۔

زیر نظر مضمون میں ہمیں میر سید علی دہلوی غمگین کی رباعیات میں تصوف کا جائزہ پیش کرنا مقصود ہے۔اس حوالے سے ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

ہے کبرو غرور سب کنا ہونے سے برا
لیکن مغرور سے تکبر ہے روا
ہمت دنیا ہو جن کی ان سے کم مل
ہے تجھ کو گر اعتماد غمگین بخدا (۹)

اس رباعی میں شاعر کہتا ہے کہ ہمیں غرور نہیں کرنا چاہیے اور غرور جو کرتا ہے اسے اللہ کی دی ہوئی چیزوں کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہے اور اگر جو اللہ کی دی ہوئی چیزوں پر ناز کرتا ہے اور دوسروں کو کچھ نہیں سمجھتا تو خدا بھی اسے ناپسند کرتا ہے۔انسان کو چاہیے کہ اپنے آپ کو بادشاہ تصور نہ کرے بلکہ وہ ہر اک چیز پر خدا کا شکر ادا کریں خدا ان لوگوں

کو دیکھ کر بہت برا محسوس کرتا ہے کہ میں نے ان کو دنیا کی ہر چیز سے نوازا ہے پھر بھی یہ لوگ غرور کرتے ہیں۔شاعر نے مصلحانہ انداز میں غرور کو ایک عیب قرار دیا ہے اور اس کی نفی کی ہے:

جو شخص ازل سے ہو شفی و ائے برآن
اور جو کہ سعید ہو وہ رہوے شادان
جیسے کہ صفت بطوں سے کرتی ہے ظہور
ویسے ہوتے ہیں فعل و ییا ایمان (۱۰)

اس رباعی میں شاعر کہتے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے اس کے بعد کی زندگی ابدی زندگی ہے۔اس کو آنے والی زندگی کی تیاری کرنی چاہیے جب انسان آنے والی زندگی کی تیاری کرے گا تو اس کی بعد والی زندگی میں اسے مسرت وخوشی حاصل ہوگی۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے اور بعد میں آنے والی زندگی ابدی ہے انسان کو اس کے لئے تیاری کرنی چاہیے۔جیسے عمل ہونگے ویسا ہی جزاوسزا کا معاملہ طے پائے گا نیک صفات کی جزا اور فعل بد کی سزا ہے:

گر قول اویس پر عمل ہو یاراں
ہو جاؤ تم ایک ایک کامل انساں
وحدت میں سلامتی ہے وہ کہتے ہیں
کیا اس کے کروں میں شرح سب پر ہے عیاں (۱۱)

اس رباعی میں شاعر یہ کہتا ہے کہ انسان اگر ایک نیک اور کامل شخص بن جائے تو وہ ایک اچھی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ انسان اپنی زندگی خوش اسلوبی سے اسی وقت گزار سکتا ہے کہ جب وہ ایک کامل انسان بن جائے اور ان اشعار میں شاعر وحدت الوجود کے متعلق بیان کرتا ہے کہ کامل شخص یا نیک انسان وہی ہوتا ہے کہ جو بھلائی کے کام کرے اور کائنات کے رازوں پر غوروفکر کرے تاکہ وہ صحیح اور غلط کی پہچان کر کے درست کام سرانجام دے سکے۔کامل ترین شخص ہی اس دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے:

کہتے ہیں جس پہ خلق سے از اشفاق
پیدا کرو چاہیے حمیدہ اخلاق
دل اور زبان و ظاہر و باطن کا
غمگین ہے اختلاف بیشک ز نفاق (۱۲)

شاعر کہتے ہیں کہ ایسے عمل کرو کہ انسان میں حمیدہ اخلاق پیدا ہوں وہ آپؐ کی زندگی کو نمونے کے طور پر دیکھے اور احادیث پر عمل پیرا ہو۔ دل میں بغض نہ رکھے اور زبان سے بھی صاف رہے۔اچھے خیالات دل میں رکھے اور اچھی باتیں کہے اس طرح اس کا ظاہر تو اچھا ہوگا ہی اس کے ساتھ ساتھ اس کا باطن بھی اچھا ہو جائے گا اور وہ ایک عمدہ اور اچھا انسان بن جائے گا۔ شاعر کہتا ہے کہ انسانوں کو اپنے ظاہری اخلاق کے ساتھ ساتھ باطن کو بھی صاف رکھنا چاہیے۔جب ظاہر اور باطن میں فرق ہو تو انسان منافقت کی طرف راغب ہوجاتا ہے ظاہر اور باطن دونوں اعتبار

سے متوازن ہونا ضروری ہے:

غمگین یہ بایزید کو آئے ندا
مشرک ہے وجود جس نے اپنا دیکھا
عالم کو دیکھ لیکن اپنے کو نہ دیکھ
تا تجھ کو دکھائی دے دو عالم میں خدا (۱۳)

اس رباعی میں شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا میں بے شمار غم ہیں ہر انسان غمگین ہے اور ہر کسی کو اپنا غم بڑا لگتا ہے، جو کوئی بھی اپنے خیالات اور اپنے افعال و اعمال کی طرف دیکھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے۔ ہمیں اس کائنات پر غور و فکر کرنا چاہیے کہ آخر اس دو جہان کا خالق و مالک کون ہے۔ اور اس کائنات کا مقصد کیا ہے اور اس میں تمام تر ہونے والے کام کس مقصد کے تحت ہو رہے ہیں۔ خدا کی ذات پر کامل یقین ہی ہمیں زندگی گزارنے اور نیک کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے:

ہے قول جنید در تصوف محمود
اپنا نہ رہے تجھے وہ کہتے ہیں شہود
لائق ہے کہ اس قدر معطل ہو تو
اُٹھ جائے نظر سے تیرے یہ نفس و وجود (۱۴)

اس رباعی میں شاعر کہتے ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے کہ وہ کسی کو غم دیتا ہے تو اس لئے کہ اس کو آزما سکے اس کو خالص کر سکے لیکن جب وہ غم سے انسان کو دو چار کرتا ہے تو اس کو دور بھی وہی کرتا ہے۔ اس لئے انسان کو چاہیے کہ اسی کے آگے اپنے غم کا اظہار کرے اللہ انسان کو آزماتا ہے اور اگر انسان اللہ کی آزمائش پر پورا اُتر آئے تو اللہ انسان سے خوش ہو جاتا ہے آزمائش میں پورا اترنے والا اور اللہ کی خاطر صبر کرنے والا اپنی آزمائش سے کامیاب باہر نکل آتا ہے اور اللہ کا قرب حاصل کر لیتا ہے اور جب انسان کو اللہ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے تو یہ اس کے لئے بڑی خوش قسمتی کی بات ہے:

یہ سید طایفہ نے ہی فرمایا
صوفی کو بس کرے ہے غمگین اتنا
اوروں سے سنے جو جانتا ہے جانے
اور اپنی کہے نہ کچھ کسی سے اصلا (۱۵)

اس رباعی میں شاعر کہتے ہیں کہ جو اوروں کے دُکھ درد کو پہچانتا ہے وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اس لئے انسان کو دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے وہ انسان کبھی مایوس اور نا امید نہیں ہوتا اس لئے انسان کو دوسروں کے کام آنا چاہیے جو صوفی دوسروں کے دکھ درد کو پہچان لیتا ہے وہ کبھی دکھ درد سے دو چار نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک اپنے دکھ درد سے زیادہ دوسروں کے دکھ درد کی پرواہ ہوتی ہے۔ صوفی انفرادی دکھ کی بجائے زمانے و معاشرے کے دکھ

درد کومحسوس کرتا ہے۔یہی انسانیت کا تقاضا بھی ہے کہ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا جائے اور لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کی جائیں اس رباعی میں درویشانہ صفات کو بڑی مہارت سے بیان کیا گیا ہے:

پوچھا ہو جنید سے کہ پیر کامل
خشوقت بتا کہ کب یہ ہوتا ہے ، دل
فرمانے لگے کہ یاد رکھ اے غمگین
جب یاد خدا میں تو ہو سب سے غافل (۱۶)

اس رباعی میں شاعر کہتا ہے کہ انسان جب خدا کو یاد کرے تو اسے چاہیے کہ دنیا سے بے خبر ہو جائے یعنی یاد خدا میں اتنا منہمک ہو جائے کہ دنیا کو بھول جائے۔شاعر کہتے ہیں کہ جب تو خدا کی یاد میں میں کھوئے تو اس دنیا سے لاپرواہ ہو کر اپنے دل میں بس اللہ کی یاد بسائے اور اللہ سے اس قدر محبت کرے کہ جب تیرے دل میں خدا کی یاد پیدا ہو تو خدا کی یاد میں سب دنیا سے غافل ہو جائے اس کے ساتھ رشتہ جوڑنے والوں کی بھلائی حاصل کرنے والا دنیا و آخرت میں کامیاب ہوتا ہے کیونکہ وہ پیر کامل ہے۔اللہ کی یاد میں دنیا سے بھی غافل ہو جاتا ہے:

پوچھا شبلی سے ہے عجب تر کیا چیز
تب اس نے کہا کہ یاد رکھ اس کو عزیز
وہ دل کہ خدا کی اپنے جس کو ہو شناخت
عاصی نہ ہو اس میں اور رکھ یہ تمیز (۱۷)

اس رباعی میں شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا بھی بہت عجیب دنیا ہے اس کی تمام تر چیزیں اس میں ہونے والے واقعات بہت ہی مختلف اور وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔اس فانی دنیا میں سکون تلاش کرنے کی بجائے آخرت کو مدنظر رکھ کر ہی ہمیں اپنے تمام کام اور فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔اس کائنات میں بہت ہی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔اس کائنات کا ہر ذرہ ہمیں کسی راز کی طرف لے جاتا ہے۔انسان کو چاہیے کہ اپنے مقصد کو سمجھے اور دنیا سے روابط بڑھانے کی بجائے اللہ سے رجوع کرے:

یہ ابراہیم کا ہے سنجیدہ مقال
بندے کو معرفت خدا کی ہے محال
جب تک کہ نہ ہو خدا سے بندہ غمگین
کس طرح مشاہدہ کرے اس کا جمال (۱۸)

اس طرح رباعی میں شاعر تصوف کے عناصر کو استعمال میں لاتے ہوئے خدا کا ذکر کرتا ہے شاعر کہتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو فرمایا ہے وہ انتہائی سچی بات ہے۔خدا کی معرفت حاصل کرنا اور خدا کی ہستی کو حقیقی معنوں میں جاننا انسان کے لئے بہت مشکل ہے انسان جب دنیا میں اپنی زندگی عیش وعشرت میں گزارتا ہے تو وہ خدا کو یاد نہیں کرتا اور شاعر کے مطابق غم بھی ایک نعمت ہے اور خدا سے رجوع کا ذریعہ ہے کامل انسان وہی ہے جو غم میں بھی اللہ کا شکر

بجا لائے شاعر نے ان اشعار میں تصوف کے موضوع کو بیان کیا ہے یہ شعرا کا بہترین موضوع ہے جو اس رباعی میں بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے:

توحید میں سیار یہ دیتا ہے خبر
نزدیک تیرے نہ دوں حق کا ہو خطر
اور دوسرے یہ کہے ہے اے غمگین وہ
کچھ خاطر خلق نہ ہو دل میں گزر (۱۹)

اس رباعی میں شاعر نے توحید کے موضوع پر بحث کی ہے کہ اس پوری کائنات کو چلانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے دنیا کا تمام نظام صرف اسی کے حکم کے تابع ہے۔ چاند، ستارے، پھول، حیوانات اور جمادات ہر چیز خدا کے حکم سے چل رہی ہے انسان کے دل میں خدا کی وحدانیت کا تصور اور اس پر پختہ یقین ہی اسے اس دنیا میں ایک نیک اور کامیاب انسان بنا سکتا ہے۔ اس بات کا سوال صرف انسان کو خدا کی وحدانیت اور اس کی حقیقت جان کر ہی مل سکتا ہے۔ اگرچہ کائنات خدا کے حکم سے چل رہی ہے۔ شاعر نے اللہ کی حاکمیت کا اقرار کیا جو کہ تصوف کا سب سے اہم موضوع ہے:

احمد نے کہا ہے یہی ہے فقرا کی صفت
اہل دنیا کو مت سمجھ بے غیرت
لائق ہے کرے دعا تو ان کو غمگین
تا پہنچے خدا بس ان پہ اپنی رحمت (۲۰)

اس رباعی میں شاعر کہتا ہے کہ یہی سادہ لوگوں کی صفت ہے سادہ لوگ جو ولی، درویش وغیرہ ہوتے ہیں ان کی یہی صفت ہے کہ وہ اللہ سے دعا مانگتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اہل دنیا کو بے غیرت یا ذلیل نہیں سمجھنا چاہیے۔ سب اپنے افعال وحرکات وسکنات کے خود جواب دہ ہیں۔ شاعر خدا کی رحمت کی بات کرتا ہے اور بے شک اللہ کارساز ہے۔ اس کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہمیں اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے اور یہی سوچ وفکر رکھنی چاہیے کہ اللہ بہتر کارساز ہے۔ شاعر نے اس رباعی میں صوفیاء کی صفت فقر پر بحث کی ہے وہ دنیا کو اپنے لیے غیر ضروری سمجھتے ہیں اور آخرت کی فکر میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں:

یہ دنیوی سے ایک بولا دانا
اللہ کو تو نے کس طرح پہچانا
تب اس نے کہا اس سے یہ اے غمگین آہ
پہچان ہوئی نہ اس کی اس سے جانا (۲۱)

شاعر اس رباعی میں کہتا ہے کہ دنیا میں رہنے والوں میں سے ایک نے بولا کہ رب کی ذات کو کس طرح جانا کہ رب کی ذات کیا ہے تب شاعر نے ایک آہ بھر کر کہا کہ اس کی ذات کو جاننے کیلئے بس اس کا ہونا اس کے بتائے ہوئے

راستے پر عمل کرنا اور اس کو جاننے کے لئے اس کی پیروی کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے رسولؐ کی اطاعت کریں تب ہی ممکن ہے کہ اس کی ذات تک رسائی حاصل کر سکیں۔ اس لئے ہمیں رب کی ذات کو سمجھنے اور جاننے کیلئے اس کی اطاعت کرنا اور اس کے حکم پر عمل کرنا ضروری ہے:

تو اور مذاہب پہ نہ لانا ایمان
یہ یاد رہے تجھے بقول سعدان
جس کا نہ طریق ہو تصوف غمگین
وہ شخص غبی ہے اور جاہل نادان (۲۲)

اس رباعی میں شاعر کسی اور مذہب پر ایمان لانے سے منع کرتے ہیں'' سعدان'' کا قول ہے شاعر تصوف کے نظریے وحدت الوجود کی طرف توجہ دلاتا ہے اور شرک سے منع کرتا ہے کہتا ہے کہ شرک مسلمان کو کفر میں مبتلا کر دیتا ہے اور دنیا کی حقیقت اسلام اور تصوف ہیں۔ جو شخص اللہ کی تمام نشانیاں دیکھ کر ان کو مدنظر رکھ کر بھی غیر اللہ سے مدد مانگے وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اگر وہ خود کو دیکھ کر بھی یہ یقین نہیں رکھتا کہ اللہ ایک ہے اور اس کی قدرت پر یقین نہیں رکھتا کہ وہی سب پر قادر ہے تو اس انسان کی عقل کا فتور ہے اور وہ نادان اور جاہل ہے۔ وحدانیت کا اقرار تصوف کا سب سے مقبول ترین موضوع ہے:

عبداللہ نے یہ کہا نہایت خوش تر
چشم دل کھول اپنی اور چشم سر
جتنی کہ صفات دیکھتا ہے غمگین
ان سب سے ہے ذات اس کی اُجلی اظہر (۲۳)

اس رباعی میں شاعر نے انسان کو اس بات کی طرف راغب کیا ہے کہ اگر انسان اپنی عقل اور اپنی آنکھوں کو صرف خدا کی ذات کو جاننے میں صرف کرے تو وہ اس ذات کی حقیقت کو جان پائے گا شاعر کہتا ہے کہ اے انسان دل کو کشادہ کر اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کہ اس کائنات میں خدا کی نعمتیں کس قدر بکھری پڑی ہیں۔ انسان جتنا بھی دکھی ہو اور جتنا بھی غمگین ہو اللہ کی ذات کے اتنا ہی قریب ترین ہوتا ہے انسان جتنا بھی کم تر ہو جائے اس کا سہارا اس کے لیے اُتنا ہی مضبوط اور باقوت ہو جاتا ہے۔ اللہ اپنے کمزور بندوں کو کبھی بے سہارا نہیں چھوڑتا شاعر نے صوفیانہ انداز میں حضرت انسان کو اللہ سے کامل رجوع کی ترغیب دی ہے:

عبداللہ کہے ہے حق سے موسیٰ نے کہا
پاؤں تجھے میں کہاں بتا مجھ کو خدا
حق سے تب اس کو یہ ہوا غمگین حکم
کر قصد درست تا کہ پاوے ہر جا (۲۴)

اس رباعی میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کو اپنی حقیقت کو جاننے کیلئے اسے پہلے خدا کی حقیقت کو جاننا ہوگا۔ جب وہ خود

کو جان لے گا تو خدا کی حقیقت سے بھی واقف ہوجائیگا۔ انسان کوصرف اپنے آپ کو جاننا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے اردگرد جو چیزیں ہیں انسان کو ان کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے قرآن انسان کو غوروفکر کی تلقین کرتا ہے اقبال نے ٹھیک کہا ہے:

ع عقل گو آستاں سے دور نہیں

انسان خدا کو اپنا حامی وناصر مان لے تو ہرغم اور پریشانی سے چھٹکارا حاصل کرسکتا ہے۔ اللہ سے دوستی اور محبت کا درس تصوف کے مقبول ترین موضوعات ہیں جسے شاعر نے اس رباعی میں بیان کیا ہے:

اس نفس کی خواہشوں سے باہر تو نکل
دل سے کر دور دین و دنیا کے خلل
گر پاس رسول ہے تجھے اے غمگین
بد خوئی کو اپنی نیک خوئی سے بدل (۲۵)

رباعی کے شعر کے پہلے مصرعے میں شاعر بڑے پیارے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اے بندے! تو اپنے نفس کی خواہشات سے باہر نکل اور اپنے دل سے دنیا کے خلل کو دور کردے تو اس دنیا میں رہ کر اپنے اعمال کی طرف توجہ دے اور اپنی برائیوں سے دور ہو کر اپنی اچھائی کو پیدا کر اس دنیا میں تجھے سوائے دھوکے کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اپنے غموں کو بھلا کر اپنی ذمہ داریوں پر توجہ دے تاکہ تیری برائیاں جونفسیاتی خواہشات پر مبنی ہیں اچھائیوں میں تبدیل ہوجائیں۔ اس شعر میں شاعر نے نفس کی خواہشوں سے دور رہنے کی تعلیم دی ہے نیز انسان کو بدخوئی کے بجائے نیک خوئی کی طرف توجہ دینی چاہیے:

غمگین جتنے ہیں حق کے اسما و صفات
کامل انسان کے ہیں وہ سب حالات
جو جو انسان کو کہے ہیں درود و خط
سب وہ اللہ کو ہیں رنج و راحات (۲۶)

رباعی کے ان مصرعوں میں شاعر بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام بہت با برکت ہیں جو شخص اللہ کے صفاتی نام کا ورد کرتا ہے وہ دنیا کے لیے ایک کامل شخص کا درجہ رکھتا ہے اور اللہ کی ذات اسے اپنی برکات سے نوازتی ہے اسی لیے شاعر نے انسان کو اللہ کے صفاتی نام کے ورد کا درس دیا ہے وہ کہتے ہیں جو شخص اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط کرتا ہے وہی کامل انسان ہے انسان اللہ سے دوستی کر کے دنیا کے رنجوں کو راحتوں میں تبدیل کرسکتا ہے:

مت کیجو تو کبھی تجزی کا گمان
اس طرح ظہور کو بطون سے تو جان

غمگین کر لاکھ بار الحمد پڑھے
الحمد میں کچھ مگر نہ ہوگا نقصان (۲۷)

اس رباعی کے اشعار میں شاعر بڑے اچھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اے بندے! تو کبھی بھی خود پر گھمنڈ نہ کر کبھی بھی خود پر غرور نہ کر بلکہ تو خود کو نیکی کی طرف راغب کر۔ یہ تیرے لئے بہتر ہے اس دنیا میں کچھ بھی نہیں اپنی آخرت کی تیاری کر یہ دنیا فانی ہے تو اپنے ظاہر کو جان اور باطن سے خود کا ناتا جوڑ۔ ہر مشکل کا حل الحمدللہ ہے الحمد للہ ہی انسان کے دل کو سکون بخشتا ہے جو انسان کے لئے رہنمائی کا باعث ہے اے بندے تو خود کو پہچان لے اور حق کی طرف راغب ہو جا:

وہ اصل مکان ہے کہ جس میں ہے جہان
پنہاں سے پنہاں سے ہے عیاں سے ہے عیان
جس میں کہ ہے تو ہی مجازی غمگین
جو تجھ میں ہے وہ تیرا حقیقی ہے مکان (۲۸)

رباعی کے ان اشعار میں شاعر بیان کرتا ہے کہ اے بندے! اصل مکان تیرا اس دنیا میں نہیں یہ دنیا فانی ہے بلکہ آخرت یعنی اس زندگی کے بعد جو زندگی آنی ہے وہ اصل زندگی ہے یہ زندگی فانی ہے اس کو ایک نہ ایک دن ختم ہو جانا ہے اے بندے! تو اس دنیا میں رہ کر اچھے اعمال کر دنیا کی رنگینیوں سے خود کو دور کر کے اچھائیوں کی طرف راغب ہو جا اے انسان تو مجازی عشق میں مبتلا نہ ہو اس میں سب دھوکہ ہے بے وفائی ہے تو غمگین ہی بن کر رہ جائے گا۔ حدیث شریف میں ہے: ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے'' اس رباعی میں شاعر نے صوفیانہ موضوع کو بیان کیا ہے جہان، عیان اور مکان کے قافیہ سے موسیقیت پیدا ہوئی ہے۔

حواشی:

(۱) ذوق، محمد ابراہیم، دیوان ذوق، لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۹۲۳ء، ص ۸۴
(۲) نجم الغنی، محمد، بحر الفصاحت، لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۹۲۶ء، ص ۱۱۴
(۳) محمد، شمس الدین بن قیس رازی، المعجم فی معائیر الاشعار العجم، مرتبہ محمد عبدالوہاب فردینی، چاپ تہران، ص ۵۶۰
(۴) طوسی، محقق نصیر الدین، معیار الاشعار، چاپ تہران، ۱۳۲۰ھ، ص ۹۸
(۵) شیرانی، حافظ محمود، تنقید شعر العجم، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۸ء، ص ۷
(۶) وزیر آغا، ڈاکٹر: مضمون ''ادب اور اخلاقیات''، مشمولہ: ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین، مرتب: سید سجاد نقوی۔ لاہور، مکتبہ عالیہ۔ ۱۹۹۵ء ص ۲۲۷،

(۷) سید صفی حیدر دانش، پروفیسر، رورق اور دیباچہ تصوف اور اردو شاعری، لاہور: سندھ ساگر اکادمی ۔ ۱۹۴۸ء

(۸) ایضاً

(۹) مکاشفات الاسرار (دیوان رباعیات) ۱۲۵۵ھ از حضرت میر سید علی غمگینؒ دہلوی، کراچی: مطبع علمی کتاب گھر، ص۱۰۰

(۱۰) ایضاً، ص۱۰۲

(۱۱) ایضاً، ص۱۰۲

(۱۲) ایضاً، ص۱۰۲

(۱۳) ایضاً، ص۱۰۴

(۱۴) ایضاً، ۱۰۴

(۱۵) ایضاً، ص۱۰۴

(۱۶) ایضاً، ص۱۰۴۔۱۰۵

(۱۷) ایضاً، ص ۱۰۵

(۱۸) ایضاً، ص ۱۰۸

(۱۹) ایضاً، ص ۱۰۸

(۲۰) ایضاً، ص۱۱۰

(۲۱) ایضاً، ص ۱۱۱

(۲۲) ایضاً، ص۱۱۲

(۲۳) ایضاً، ص۱۱۴

(۲۴) ایضاً، ص ۱۱۵

(۲۵) ایضاً، ص ۱۱۸

(۲۶) ایضاً، ص ۱۱۹

(۲۷) ایضاً، ص۱۲۰

(۲۸) ایضاً، ص۱۲۱